© rasailojaraid.com

سید محمد ذوالکفل بخاری

روشن ستارہ

آسمان کی کھیتی اپنی بے کراں وسعتوں میں لہلہاتی، جھلملاتے تاروں کی فصل کے انگ انگ سے پھوٹتے ہوئے شباب نور سے حظ اٹھانے میں غلطاں تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا اور میں صحن میں بیٹھا آسمان کے قبائے نیلگوں سے پھوٹ پھوٹ کر آنے والے ستاروں کی روپہلی روشنی اور چاند کی کیف آور چاندنی کے سنگم سے فضا پر طاری نورانیت کے طفیل ایک روشن روشن ورق پر، اپنے دیرینہ رفیق اپنے قلم کی رفاقت میں دل و نگاہ کی مسلمانی کے ایک آفاقی مبلغ کی یادوں بھری باتوں اور باتوں بھری یادوں کو رقم کرنے میں مصروف تھا کہ نہ معلوم کب نندیاپور کے ہرکاروں نے مجھے اغوا کر لیا۔

اچانک کسی نے میرے قریب آکر کہا بیٹا! صبح ۲۱ اگست ہے نا! آواز کی شفقت و ملائمت اور لہجے کا شکوہ، میرے رگ و پے میں عقیدت و احترام کا رس گھولتا چلا گیا میں نے پلٹ کر کہنے والے کو دیکھنا چاہا، مگر نگاہیں اس پیکر نورانی کے جلوے کی تاب نہ لا سکیں تو ریاض خیر آبادی نے بروقت مدد کی۔

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
یہ آدمی ہے مگر، دیکھنے کی تاب نہیں

میں نے جھکے ہوئے سر کو ذرا اوپر کیا اور کہا ہاں! بابا جی صبح ۲۱ اگست ہی ہے مگر آپ....... میرا سوال ابھی تشنہ تکمیل تھا کہ اس نے جواب دیا کہ ہاں ہاں، میں یہ بھی بتاؤں گا کہ ۲۱ اگست سے میرا کیا تعلق ہے؟ پہلے یہ بتاؤ کہ صبح تم کیا کرو گے؟ اور یہ رات گئے تک بیدار کیوں رہے؟ میں نے عرض کی کہ حضرت! صبح میرے دیس کے ایک بطل جلیل کا یوم وفات ہے جس نے نصف صدی تک میری قوم میں حرارت ایمانی کی دولت نایاب کو بے دریغ تقسیم کیا اور جو.......! میں کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا کہ بزرگ پھر بولے، اچھا، تو تم اس شخص پر مضمون لکھو گے؟ اور کسی مجمع میں داد پانے کے لئے اپنے مضمون کو بڑے خطیبانہ ڈھنگ سے سنا ڈالو گے؟ میرے چہرے کے تاثرات سے اثبات میں جواب پا کر اس نے کہا کہ مجھے سناؤ گے؟ جو تم نے لکھا ہے! اور.... میں عہد حاضر کے ہر قلم کار کی طرح جو اپنی تخلیقات کسی نہ کسی کو سنانے کے لئے باؤلا سا پھرا کرتا ہے، فوراً راضی ہو گیا۔ پھر میں نے کہنا شروع کیا کہ "تواریخ انقلابات عالم اس بات کی عظیم الشان شاہد ہیں کہ جب بھی کسی معاشرے میں اس کی تمدنی، تاریخی ثقافتی اور تہذیبی حقیقتوں سے کنارہ کشی کا رجحان بڑھنے لگے تو اس معاشرے کا ارتقا لازماً موقوف ہو جاتا ہے اور پھر جوں جوں قوم کے اس روش پر چل نکلنے کے عمل میں تیزی آتی ہے تو اس قوم کے من حیث المجموع زوال کی وادی ظلمت کی طرف بڑھتے ہوئے قدم بھی اسی سرعت و شدت کے ساتھ اس قوم کو اس کے انجام سے ملا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دینے کے لئے رواں دواں ہو جاتے ہیں ۔ اور پھر بالآخر دھکتی آنکھیں اور سوچتے ذہن اس انجام کو حقیقت ماننے پر مجبور ہوتے ہیں مگر' ایک اضطراب کے ساتھ ! لیکن پھر وہی انجام ایک آغاز کو جنم دیتا ہے ۔ یہ آغاز دراصل اسی اضطراب کا نقش اول ہوتا ہے ۔ اور یہ سب کچھ پلک جھپکنے میں نہیں ہو جاتا کہ جسے مفکر کے فکر' مصنف کی تصنیف' مولف کی تالیف' خطیب کے خطاب' شاعر کے اشعار' مغنی کے نغمہ' مجذوب کی بڑ' فقیر کی صدا سخن ور کے تخیل یا دیب کے ادب پاروں میں سمویا یا پایا جاسکے بلکہ اس کی تفہیم و تشریح کے لئے ایک مطالعاتی و مشاہداتی سفر درکار ہوتا ہے ۔ یہ سفر جو قوموں کے خوابیدہ دل و دماغ میں انقلاب کی نیور رکھتا ہے ۔ یہ سفر صدیوں پر محیط بھی ہو سکتا ہے ۔ اور برسوں میں منتج بھی ۔ یہ سفر دلچسپ بھی ہوتا ہے اور کٹھن بھی ۔ امید و نومیدی' آس و یاس اور جانکنی و جاں نثاری اس سفر ہی کی کیفیات ہیں دوران سفر کچھ مرحلے ایسے بھی آتے ہیں کہ جب ولولے وسوسوں کی نذر ہو جاتے ہیں اور کبھی خدشات و موانعات حوصلوں کے مقابلے ہیچ نظر آنے لگتے ہیں ۔ اور پھر ایسے میں خلاق اعظم و رب کائنات کوئی روشن ستارہ انسانی پیکر کی صورت میں وہاں وارد کرتا ہے ۔ جوان میں خودی اور خود آگہی کا بیج بوتا ہے اور جو اپنے خون سے' ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے پروا ہو کر اس بیج کی آبیاری کرتا ہے ۔ تب ۔ وہ ہمہ انتظار بن جاتا ہے ان لمحوں کے لئے جس سے یہ مژدہ جانفزا اس کے دل و دماغ کی پنہائیوں اور روح کی گہرائیوں تک میں سرشاری کی لہریں دوڑانے لگے کہ اس کی قافلہ سالاری میں بڑھنے والا قافلہ خودی اور خود آگاہی کا جوہر' اپنا زاویہ فکر و نظر اور صدائے قلب و جگر بنا چکا ہے اور آج اس قافلہ کا اپنا تشخص' اس کا ایمان اور اس کی پہچان ہے اور قافلہ والوں کو اپنی پہچان عزیز از جان ہے ۔ تو اس کی آنکھوں میں بحبت و انبساط اور مسرت و اطمینان چھلکا پڑتا ہے ۔ واقعی ! بڑی خوش بختی کے غماز ہوتے ہیں وہ لمحات ! اور اگر ...... " میں کچھ اور کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ بزرگ نے عجیب بے نیازانہ لہجے میں مصرعہ با آواز بلند دھراتے ہوئے پھر میرے سلسلہ کلام کو منقطع کر دیا ۔

گفتار کا تُو غازی تو بنا ، کردار کا غازی بن نہ سکا ۔

ویسے میں جب بزرگ کو مضمون سنا رہا تھا تو بزرگ کے چہرے کی کیفیات بھی میری توجہ کا مرکز رہی تھیں ۔ اس کے چہرے پر کبھی جلال کی سرخی دوڑنے لگی تو کبھی چہرہ بالکل سپاٹ' مگر جمالیاتی شاہکار بن کر رہ جاتا کبھی پیشانی پر کوئی متفکر سی شکن نمودار ہوتی تو دوسرے ہی لمحے ایک دلنواز تبسم میں ڈھل کر اس کے ہونٹوں پر رقصاں ہو جاتی میں جو اب تک سوچنے یا سمجھنے اور کہہ لینے سے عاری' صرف بزرگ کی شخصیت میں کھو کر محسوسات کا پیکر بن کر رہ گیا تھا ۔ آخر بول اٹھا کہ

" اے بزرگ عالی مرتبت ! میں آپ سے تعارف کا خواہش مند ہوں' خدارا اس التجا کو ٹھکرایئے گا نہیں " یہ سننا تھا کہ معاً اس کی کیفیت بدل گئی مجھے ایک بھرپور نگاہ سے نوازتے ہوئے اچانک اس نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نگاہیں ہٹائیں اور ایکا ایکی قلندرانہ لے میں بولنا شروع کر دیا۔

" چوالیس برس لوگوں کو قرآن سنایا ' پہاڑوں کو سناتا تو عجب نہ تھا کہ ان کی سنگینی کے دل چھوٹ جاتے۔ غاروں سے ہم کلام ہوتا تو جھوم اٹھتے۔ چٹانوں کو جھنجھوڑتا تو چلنے لگتیں۔ سمندروں سے مخاطب ہوتا تو ہمیشہ کے لئے طوفان بکنار ہو جاتے۔ درختوں کو پکارتا تو وہ دوڑنے لگتے۔ کنکریوں سے کہتا تو وہ لبیک کہہ اٹھتیں۔ صرصر سے گویا ہوتا تو صبا ہو جاتی۔ دھرتی کو سناتا تو اس کے سینے میں بڑے بڑے شگاف پڑ جاتے۔ جنگل لہرانے لگے۔ صحرا سرسبز ہو جاتے۔ افسوس میں نے ان لوگوں میں معروفات کا بیج بویا جن کی زمینیں ہمیشہ کے لئے بنجر ہو چکی تھیں ' جن کے ضمیر قتل ہو چکے تھے جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط تھا ' جن کی پستیاں انتہائی خطرناک تھیں ' جو برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ جن میں ٹھہرنا المناک اور جن سے گذر جانا طرب ناک تھا۔ جن کے سب بڑے معبود کا نام طاقت تھا جو صرف طاقت کی پوجا کرتے تھے تیرہ سو برس کی تاریخ انہی حادثوں کی کہانی ہے۔ انہی چھچھورے ' ناسمجھ اور متحرک جانوروں کو دیکھ کر زرتشت نے کہا تھا کہ " اس کا آنسوؤں اور گیتوں کی طرف میلان ہوتا ہے۔ یہاں امراء دوزخ کے کتے اور سیاستدان کھٹی تے ہیں۔ ان کے ساتھ نٹ اور ان کے پیچھے لاشیں چلتی ہیں۔ ان کی واحد خوبی یہ ہے کہ ہر نیکی اور برائی کی زبان میں جھوٹ بول لیتے ہیں "۔ بیٹا ! ڈھونڈ سکتے ہو تو ان افکار میں میری سوانح عمری کی بنیادیں اور میرا تعاف ڈھونڈ لو۔ " اور پھر اس نے ایک کربناک مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور کہا " ہاں سنو ' ۲۱ اگست سے میرا تعلق ! شاید تم مجھے نہیں پہچانتے۔ میں وہی ہوں جو ۲۱ اگست کو قوم سے رخصت ہوا اور تم ؟ تم مضمون لکھتے اور پڑھتے رہے ...." وہ کچھ اور بھی کہتے مگر میں " شاہ جی " ! کہہ کر ان سے لپٹ گیا۔ میں نے کہا " شاہ جی " آپ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ .

" ہم جنوں کی شاخ سے گرے ہوئے پتے ہیں۔ ہم موت کے انتظار میں ہیں حالانکہ ہم مر چکے ہیں ۔ کیا جانتے ہو ' کہ ہم نے اس کمزوری اور ناتوانی کے باوجود کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔
ہم نے لومڑیوں (بزدلوں) کا مسلک اختیار نہیں کیا۔ اور ہم نے نہ ہی گدھوں (احمقوں) کی پیروی کی ہے ۔ ہم فقر کے بوریا نشین اپنی مثال آپ ہیں " ؎

میری بات کو شاہ جی نے بغور سنا اور پھر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا شاہ جی کوئی

؎ از شاخ جنوں فتادہ برگیم — مردیم در انتظار مرگیم
باایں ہمہ ضعف و ناتوانی — دانی ! کہ چہ کارہانہ کردیم
مامسلک روبہی نہ رفتیم — باپیروی خراں نہ کردیم
برمسند فقر یگانہ فردیم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نصیحت ؟ فرمایا "بیٹا ! محرومیوں کے باجود اپنی ذات پر اعتماد قائم رکھنا۔ قوموں کی زندگی ایک تسلسل کا نام ہے اس تسلسل کو قائم رکھنا" اس کے ساتھ ہی ایک جھماکہ ہوا اور میرے ساتھ محو گفتگو ہستی ایک نورانی سے ہیولے کی صورت میں اوپر کو اٹھ گئی گویا کوئی ستارہ میرے قریب سے ہو گزرا تھا۔ اتنے میں مئوذن کی صدا نے مجھے بیدار کر دیا۔ اللہ اکبر اللہ اکبر! اور میں یہ پڑھتا ہوا اٹھ بیٹھا کہ

کمان شب سے سحر کار تیر چھوڑ گیا
ستارہ ٹوٹ کے روشن لکیر چھوڑ گیا

(۲۱ اگست ۱۹۸۵ء کو ملتان میں ★ یوم امیر شریعت کی تقریب میں پڑھا گیا۔

اعترافِ عظمت

"جن قیدیوں نے مجھے اثنائے ملازمت میں متاثر کیا ان میں عطاءاللہ شاہ بخاری نام کا ایک سیاسی قیدی بڑی ہی دلفریب شخصیت کا مالک تھا، اس کا چہرہ مہرہ چرچ کے ان مقدس راہبوں کی طرح تھا جن کی تصویریں یسوع مسیح سے مشابہ ہوتی ہیں۔ یا پھر ان مستشرقین کی طرح جنھیں یورپ میں خاص عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم اسے عرب کے بڑے بڑے قاموسیوں سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں لیکن ان کے صحیح شناسا ہمارے ہاں کتنے ہیں؟ میں اسے اپنا دوست بنانا چاہتا تھا لیکن ہمارے درمیان سب سے بڑی روک ہماری مختلف زبانیں تھیں۔ وہ ۱۸۵۷ء کے اس "اینٹی برٹش" ذہن کی باقیات میں سے تھا جنھیں ہمارے پیشروؤں نے علماء کو پھانسی دے کر پیدا کیا تھا۔"

کرنل حاڈر
(انگریز سپرنٹنڈنٹ ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی۔ ۱۹۳۹)
"ہندوستان کی یادیں" مطبوعہ لندن

ایسا شخص جو اپنی ایک تقریر سے بیک وقت دو حکومتوں کے نظام کو معطل کر دیتا ہے۔

وزیر ہند
(گول میز کانفرنس لندن میں اعتراف)

یہ غیر معمولی انسان ہندوستان کی سب سے زیادہ اثر آفریں شخصیت ہونے کا نہایت قوی دعویٰ کر سکتا ہے۔

مشہور انگریز مؤرخ
"مسٹر ڈبلیو سی سمتھ"
(ماڈرن اسلام ان انڈیا)
صفحہ ۲۶۶۔ مطبوعہ لندن ۱۹۴۶ء

© rasailojaraid.com